عالمِ عربی کے معروف عالم شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ شعیب ارنؤوط کی نظر میں

ترجمہ وترتیب: مولانا محمد یاسر عبداللہ

شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۲ھ-۱۹۱۴ء/۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء) گزشتہ صدی میں عرب دنیا کے معروف عالم گزرے ہیں۔ ابتدائے عمر میں ہی ان کا خاندان البانیہ سے ہجرت کر کے شامی شہر دِمشق میں آبسا اور وہیں شیخ کی علمی نشوونما ہوئی، بعد میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ اور دیگر تعلیمی اداروں کی رونق بنے۔ ان کا اختصاصی فن ''علمِ حدیث'' تھا، آغازِ شباب میں ہی اس علم سے رشتہ جوڑا اور پھر تادمِ آخر اسی کے ہو رہے، اکثر علمی کاوشیں اسی علم کی خوشہ چینی کا ثمرہ ہیں۔ اپنی بعض منفرد تحقیقات کی بنا پر معاصر اہلِ علم کی تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں [1]، انہی ناقدین میں سے ایک عصرِ حاضر کے معروف محقق شیخ شعیب ارنؤوط بھی ہیں، جو خود بھی البانوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا خاندان بھی شام کی طرف ہجرت کر کے یہیں بس گیا تھا۔ شیخ البانیؒ کے ساتھ ان کے خاندانی تعلقات استوار رہے ہیں، کچھ عرصہ قبل شیخ ارنؤوط کے ایک شاگرد شیخ ابراہیم زیبق نے ان کے حالات اور علمی خدمات پر ایک کتاب ترتیب دی تھی، جو ''المحدّث العلّامة الشيخ شعيب الارنؤوط، سيرته في طلب العلم وجهوده في تحقيق التراث'' کے نام سے عالمِ عرب کے معروف اشاعتی ادارے ''دار البشائر الإسلاميّة، بيروت'' سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے، اس کتاب کے ایک حصے میں شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات کے متعلق ان کی بعض تنقیدی آرا کا تذکرہ ہے۔ علمی دنیا میں اختلاف کوئی اَنہونی چیز نہیں، ''آدابِ اختلاف'' کی رعایت رکھتے ہوئے متانت کے ساتھ شائستہ لب و لہجے اور سنجیدہ اسلوب میں اپنی آرا کا اظہار، معتدل مزاج اہلِ علم کا امتیازی خاصہ رہا ہے۔ شیخ ارنؤوط کی یہ تحریر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، چونکہ شیخ بذاتِ خود ایک نام وَر محقق ہیں، شیخ البانیؒ سے ان کے خاندانی مراسم رہے ہیں، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے کے مواقع انہیں حاصل رہے ہیں اور ان کی کتب وتحقیقات پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں، اس لیے تحریر کے مندرجات سے کلی اتفاق نہ ہونے کے باوجود ان کا یہ علمی نقد وتبصرہ' فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت کتاب کے اس حصے کو اردو ترجمانی کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا امتیازی کارنامہ

مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تردّد نہیں کہ شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ کو بیک وقت اپنے موافق ومخالف دونوں طبقوں میں علمِ حدیث کے مطالعے اور اس میں مزید تحقیق وجستجو کا شوق ورغبت پیدا

کرنے کا شرف حاصل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ (ماضی قریب میں) انہیں کے دم قدم سے مصر وشام میں حدیثی مشاغل کو دوبارہ توانائی نصیب ہوئی ہے۔ اس کارنامے پر اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کا اجر وثواب ان کے نامۂ اعمال میں محفوظ فرمائے۔ لیکن وہ اس میدان کے پہلے شہسوار نہیں تھے، ان سے قبل مصر میں شیخ محمد رشید رضا، شیخ احمد شاکر اور ان جیسے دیگر ازہری علما اور شام میں شیخ جمال الدین قاسمی اور شیخ محمد بہجۃ البیطار جیسے (محدثین) گزر چکے ہیں، بنابریں انہیں ترکِ تقلید ورجوع الی السنۃ کا داعیٔ اول نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن انہوں نے اپنے ان پیش رؤوں کے سنجیدہ واطمینان بخش اسلوب سے استفادہ نہیں کیا، بلکہ مخالفین کے ساتھ اشتعال انگیز انداز اپنایا، گویا (اس طرزِ عمل سے) وہ انہیں قائل کرنے کی بجائے شکستہ کردینا چاہتے تھے، نتیجتاً (مسلمانوں کے) دو طبقوں کے درمیان ایسی معرکہ آرائی ہوئی کہ جس میں علمی مباحثہ ومناقشہ کی بجائے سب وشتم تک نوبت جا پہنچی۔

مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں کہ شیخ کتاب وسنت کے داعی تھے جو بلاشبہ خوش آئند راہ ہے، لیکن درحقیقت وہ اپنی تحقیق کی روشنی میں صحیح قرار پانے والی احادیث وسنن کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کی چاہت تھی کہ ان کی تصحیح کو ائمہ متبوعین کے اجتہاد کے برابر کا درجہ حاصل ہو اور متنازع مسائل میں انہی کی رائے ''قولِ فیصل'' قرار پائے۔ لیکن یہ مقام نہ انہیں حاصل ہوا اور نہ ان کے علاوہ کسی کے حصے میں آیا، اس لیے کہ (ائمہ فقہا کا) یہ اختلافِ محمود اللہ تعالیٰ کا پسندفرمودہ ہے اور اسی کے پیدا کردہ اسباب کے تحت وجود میں آیا ہے۔

(غور کیجیے کہ) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو محض بارگاہِ رسالت (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے علم حاصل کرنے والے تھے، لیکن اس کے باوجود بعض مسائل میں ان کے درمیان بھی اختلاف ہوا ہے۔ نیز اختلافی مسائل میں سے جس مسئلے میں بھی ائمہ نے نصوص کی بنیاد پر کوئی قول اختیار کیا ہے، اس کی نظیر صحابہؓ وتابعینؒ میں ملتی ہے۔ فقہی مسائل میں اختلاف کا آغاز عہدِ صحابہؓ میں ہی ہوچکا تھا اور یہ عین منشأ خداوندی کی تکمیل تھی، اسی کا ثمرہ ہے کہ ہماری اسلامی تہذیب میں تنوع اور فہم کے دائروں میں وسعت دکھائی دیتی ہے، جس میں فکری واختراعی مقابلے کے لیے کھلا میدان مہیا ہے۔ اگر علمی اختلافات نہ ہوتے تو یہ عظیم تالیفات منظرِ عام پر نہ آتیں، جن کی بدولت دورِ تدوین سے آج تک ہمارے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

علمِ حدیث اور شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا امتیازی فن ''علمِ حدیث'' ہے، اس علم کے مطالعہ وتحقیق میں شیخ نے اپنی زندگی کی طویل مدت تقریباً ساٹھ برس صرف کیے ہیں، البتہ شیخ کو اس فن میں دیگر محدثین کا سا مقام

ہی حاصل ہے، یعنی ان سے بھی خطأ وصواب دونوں کا صدور ہوا ہے۔

’’نقدِ متن‘‘ کی طرف عدمِ التفات

مجھے شیخ کی اس بات سے بے حد تعجب ہے کہ انہوں نے ’’**علم مصطلح الحدیث**‘‘ میں ضرور پڑھا ہوگا کہ ’’حدیثِ صحیح وہ ہے کہ جس کی سند راوی سے لے کر نبی کریم ﷺ تک متصل ہو اور وہ روایت’ علت یا شذوذ سے خالی ہو‘‘۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ احادیث پر حکم لگانے کے سلسلے میں انہوں نے ’’شذوذ‘‘ اور ’’علت‘‘ کی طرف توجہ کی، نہ متنِ حدیث پر نقد کرتے ہوئے ان سے اعتنا کیا، لہٰذا ان کے ہاں اسناد ’’صحیح‘‘ ہو تو حدیث بھی ’’صحیح‘‘ قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسی بہت سی احادیث کو ’’صحیح‘‘ قرار دیا ہے، جن کے متون پر علما کو کلام ہے، مثلاً:

۱- ’’**مشکوٰۃ المصابیح**‘‘(۲) اور ’’**صحیح الجامع الصغیر**‘‘(۳) کی روایت ہے: ’’**الوائدۃ والموؤدۃ فی النار**‘‘۔ (بچی کو زندہ گاڑنے والی عورت اور جس کو گاڑا گیا ہو دونوں دوزخ میں ہیں) شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ’’صحیح‘‘ کہا ہے، حالانکہ یہ حدیث، قرآنی آیت ’’**وَإِذَا الْمَوْؤُدَۃُ سُئِلَتْ**‘‘(۴) (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جاوے گا) کے صراحتاً خلاف ہے، اگرچہ شیخ نے اس کی دل نہ لگتی توجیہ وتاویل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- ’’**سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ**‘‘(۵) میں شیخ نے درجِ ذیل روایت کو ’’صحیح‘‘ قرار دیا ہے: ’’**إن اللّٰہ خلق التربۃ یوم السبت**‘‘ (اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا ہے) اس روایت کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ’’**صحیح مسلم**‘‘(۶) میں اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن یہ حدیث’ قرآنِ کریم کے متعارض ہے۔ نیز سند میں اسماعیل بن امیہ کی وجہ سے اس کو ’’**معلول**‘‘ بھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ اسماعیل نے اس کو درجِ ذیل سند کے ساتھ روایت کیا ہے: ’’**إسماعیل، عن أیوب بن خالد، عن عبد اللّٰہ بن رافع -مولٰی أم سلمۃ- عن أبی ہریرۃؓ مرفوعاً**‘‘۔

اسماعیل ہی نے اس روایت کو ’’**عن إبراہیم بن أبی یحیی، عن أیوب بن خالد**‘‘ کے طریق سے بھی نقل کیا ہے اور چونکہ ابراہیم ’’**متروک**‘‘ ہیں، اس لیے اسماعیل نے ان کو سند سے ساقط کر دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ’’**التاریخ الکبیر**‘‘(۷) میں اسماعیل بن امیہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے، امام موصوف نے بعض محدثین کا قول نقل کیا ہے کہ: ’’**عن أبی ہریرۃؓ عن کعب**‘‘، اصح ہے‘‘، یعنی یہ روایت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی اسرائیلیات میں سے ہے، لیکن شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ’’یہ بعض کون ہیں؟ اور حفظ وضبط کے اعتبار سے ان کا کیا مقام ہے، تاکہ اس روایت کو عبد اللہ بن رافع کی روایت پر ترجیح دی جا سکے؟‘‘۔ آگے لکھتے ہیں کہ: ’’یہ حدیث’ قرآنِ کریم کے خلاف نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے‘‘۔ لیکن عدمِ مخالفت پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

۳-''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۸) میں درج ذیل روایت کو شیخ نے ''صحیح'' قرار دیا ہے: ''أمتي أمة مرحومة، ليس عليها عذاب في الآخرة، وإنما عذابها في الدنيا''۔ (میری امّت پر خدا کی خاص رحمت ہے، اس کے لیے آخرت میں کوئی عذاب نہیں، اس کا عذاب دنیا میں ہی ہے) اور تصحیح کی علت بیان کرنے کی کوشش یوں کرتے ہیں کہ: ''امت سے مراد امت کی اکثریت ہے، اس لیے کہ یہ بات تو قطعی ہے کہ بعض لوگ گناہوں سے پاکی حاصل کرنے کے لیے جہنم میں داخل ہوں گے''۔ ہم نے ''مسند احمد''(۹) کی تعلیق میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور فنِ حدیث کے ماہر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''التاريخ الكبير''(۱۰) میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے اس حدیث کے طرق اور ان میں اضطراب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''والخبر عن النبي ﷺ في الشفاعة، وأن قومًا يعذبون ثم يخرجون أكثر وأبين وأشهر''۔ یعنی ''شفاعت اور کچھ لوگوں کو عذاب دے کر جہنم سے نکالے جانے کے متعلق بہت سی احادیث ہیں، جو زیادہ واضح اور مشہور ہیں''۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سند کا اضطراب بیان کرنے کے ساتھ متن پر بھی نقد کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ روایت ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جو (کثرت کی بنا پر) تواتر کے قریب ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ: ''امتِ محمدیہ کے کچھ لوگ ابتداءً جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے نکالے جائیں گے''۔

بہر کیف شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ''نقدِ متن'' کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے تھے(۱۱)، ان کا دعویٰ تھا کہ متقدمین نے ''نقدِ متن'' کے لیے کوئی منہج متعین نہیں کیا اور نہ ہی اس کے طے شدہ ضوابط ہیں، حالانکہ یہ ایک کمزور نکتہ نظر ہے، ہمارے اس موقف کی دلیل کے طور پر شیخ کی کتاب ''الإجابة فيما استدركته عائشة على الصحابة'' کافی ہے، جس کا موضوع ''نقدِ متون'' ہی ہے۔

''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' میں عدمِ تفریق

میرے نزدیک ایک اور قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ شیخ ''لفظِ شاذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' کے درمیان فرق نہیں کرتے، اس مسئلے میں ان کا حال متاخر محدثین جیسا ہے، حالانکہ ''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' دونوں واضح اصطلاحات ہیں اور (محدثین کے ہاں) معروف ہے کہ ''لفظِ شاذ وہ ہے جس کو کسی شیخ کا ایک راوی اکیلا اپنے شیخ سے روایت کرے، جبکہ دیگر شاگرد اس کو نقل نہ کرتے ہوں''۔ اب اس راوی سے کہا جائے گا کہ آپ یہ لفظ کہاں سے لائے، جس کو ایک بڑی جماعت آپ کے شیخ سے روایت نہیں کرتی؟۔

ائمہ متقدمین، امامِ متقن کی ''زیادتِ ثقہ'' کو قبول کرتے تھے، نیز ''زیادتِ ثقہ'' اور ''شذوذ'' کے درمیان فرق کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث یاد آ رہی ہے، جو

بحالتِ تشہد انگشتِ شہادت کو حرکت دینے کے متعلق ہے، اس روایت میں عاصم بن کلیب سے صرف ایک راوی زائدہ بن قدامہ نے ''یحرّکھا'' کا لفظ نقل کیا ہے، عاصم کے باقی شاگرد: عبدالواحد بن زیاد، شعبہ، سفیان ثوری، زہیر بن معاویہ، سفیان بن عیینہ، سلام بن سلیم ابوالاحوص، بشر بن مفضل، عبداللہ بن ادریس، قیس بن ربیع، ابوعوانہ اور خالد بن عبداللہ واسطی ''یحرّکھا'' کی بجائے ''یشیر بھا'' کے الفاظ نقل کرتے ہیں، میں نے ''مسند احمد'' کی تعلیق میں ان تمام طرق کی تخریج کی ہے (۱۲)۔

شیخ ناصرؒ نے ''سلسلة الأحاديث الصحيحة'' (۱۳) میں لفظِ ''یحرّکھا'' کو ''صحیح'' قرار دینے کی علت یہ بیان کی ہے کہ: ''لفظِ اشارہ' تحریک کے منافی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اشارہ کے الفاظ ''تحریک'' کے متعلق صریح نہ ہوں گے، لیکن منافی بھی نہیں''۔

کیا متقدمین علمائے حدیث کے منہج کے موافق اس شاذ لفظ کو ''صحیح'' قرار دینے کے لیے یہ تعلیق کافی ہے؟

اپنے مذہب کی مؤیّد روایات کی تصحیح اور ائمہ مجتہدین پر بے جا تنقید

بعض اوقات شیخ ایسی احادیث کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں، جو ان کے مذاہب کے موافق ہوں، اگرچہ ان کا کوئی قوی شاہد موجود نہ ہو۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث یاد آئی کہ: ''جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیتِ مبارکہ تلاوت کرتے ہوئے سنا: ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (۱۴) (انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے) تو حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے؟ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ہاں وہ لوگ بھی اپنے علما کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب علمائے یہود و نصاریٰ ان لوگوں کے لیے کوئی چیز حلال قرار دیتے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب ان پر کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے، یہی ان کی عبادت کرنا ہے''۔

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''جامع الترمذی'' (۱۵) میں ضعیف کہا ہے اور اس کا کوئی قوی شاہد بھی نہیں ہے، اس کے باوجود شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''صحیح الترمذی'' (۱۶) میں اس کو ''صحیح'' قرار دیا ہے۔ اور ''سلسلة الأحاديث الصحيحة'' (۱۷) میں تفسیر ''روح المعانی'' (۱۸) کے حوالے سے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

''والآية ناعية على كثير من الفرق الضالة الذين تركوا كتاب الله وسنة نبيه -عليه الصلاة والسلام- لكلام علماء هم ورؤساء هم، والحق أحق بالاتباع، فمتى ظهر وجب على المسلم اتباعه، وإن أخطأ اجتهاد مقلده''۔

''اس آیت میں ان گمراہ فرقوں کو مطعون کیا گیا ہے، جنہوں اپنے علما و رؤسا کی باتوں کی بنا پر خدا کی کتاب اور نبی کی سنّت سے روگردانی اختیار کر لی تھی، حالانکہ حق اتباع کا زیادہ

حقدار ہے، لہٰذا جب حق ظاہر ہو جائے تو مسلمان پر اس کی اتباع واجب ہے، اگرچہ اپنے امام مقلَّد کو غلط قرار دینا پڑے۔''

شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ بالا حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے ائمہ متبوعین پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس موضوع پر میری ان سے گفتگو بھی ہو چکی ہے، میں نے ان سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر علما و مشائخ کو رب بنانے اور ائمہ مجتہدین (کی تقلید) میں بڑا فرق ہے، اس لیے کہ علمائے یہود و نصاریٰ تو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو ان لوگوں کے لیے حلال قرار دیتے تھے، جبکہ یہ ائمہ اپنے اجتہادات میں کتاب وسنت پر اعتماد کرتے تھے، لہٰذا (مشہور حدیثِ مبارکہ کی بنا پر) جس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جس سے خطأ واقع ہوئی تو اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔ ان ائمہ کو علمائے یہود و نصاریٰ کے برابر قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

غیر واضح منہجِ تحقیق

چند چھوٹے رسائل کے علاوہ دیگر حدیثی کاوشوں میں شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی واضح منہج نہیں تھا، بہت پہلے وہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ''**الجامع الکبیر**'' اور ''**الجامع الصغیر**'' سے ضعیف احادیث تلاش کر کے ''مکتبۂ ظاہریہ'' میں موجود ''**أجزاء حدیثیة**'' میں ان کے متعلق جو مطالعہ کرتے تھے، اسے ایک الگ کاغذ پر لکھ لیا کرتے تھے، یوں جب ان کے پاس سو یا زیادہ احادیث جمع ہو جاتیں تو ایک چھوٹے رسالہ کی صورت میں چھاپ دیتے تھے، ان میں موضوع اور باطل احادیث بھی ہوتی تھیں۔

میری دانست میں ان احادیث کو نئے سرے سے لوگوں میں پھیلانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ وہ بھلائی جا چکی تھیں اور اہلِ زمانہ میں سے کوئی ان سے واقف نہ تھا، مثلاً: ''**علیکم بالعدس، فانه قدس علی لسان سبعین نبیًا**''۔ (دال کو لازم پکڑو، اس لیے کہ یہ ستر انبیاءؑ کی زبانی مقدّس (غذا) ہے)[19] اور اس جیسی دیگر احادیث۔ شیخ نے ''**سلسلة الأحادیث الضعیفة**'' میں ایسی احادیث کو شائع کر دیا ہے، بہتر ہوتا کہ یہ موضوع احادیث نسیان کے پردوں میں ہی گم رہتیں، البتہ لوگوں کے درمیان معروف ومشہور احادیث کا حال بیان کرنے اور ان پر نقد کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سلسلے میں ان کی محنت قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اسی طرح ''**سلسلة الأحادیث الصحیحة**'' میں بھی ان کا کوئی واضح منہج نہیں ہے، اس لیے کہ شیخ کو کوئی بھی صحیح حدیث ملتی تو وہ (اپنے تئیں) حدیثی نقطۂ نظر سے اس کی تحقیق کر کے اسے اس سلسلے میں درج کر لیتے تھے، ان احادیث کو جمع کرنے کا مشترک پہلو صرف یہ تھا کہ شیخ کو ان کی صحت کا اعتقاد ہے (اور ان کی تحقیق کے مطابق یہ صحیح احادیث ہیں)، میری رائے میں محض یہ بات ایک مستقل کتاب میں احادیث جمع کرنے کے لیے کافی نہ تھی، نیز (اس کتاب کی احادیث میں کسی موزوں ترتیب

کا لحاظ نہیں رکھا گیا، بلکہ کیفما اتفق ذکر دی گئی ہیں) اگر وہ ان احادیث کو موضوع وار جمع کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

تقسیمِ احادیث اور اسانید کا حذف

شیخ کی قابل مواخذہ باتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ موصوف نے جب ''سننِ اربعہ'' (سننِ ابوداؤد، سننِ ترمذی، سننِ نسائی اور سننِ ابنِ ماجہ) کی ''صحیح وضعیف'' احادیث کو جدا جدا شائع کیا تو ان کی اسانید حذف کر ڈالیں، حالانکہ علمی دیانت کا تقاضہ تھا کہ وہ سندوں کو حذف نہ کرتے، اس لیے کہ ''صحیح وضعیف'' کی پہچان کا اہم مدار سند ہی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس طرزِ عمل سے گویا وہ لوگوں کو آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ شیخ کی تحقیق پر ہی اعتماد کریں، اور ان کی تحقیق جس حکم تک پہنچی ہے وہ حق اور ناقابلِ مناقشہ ہے۔

نیز حدیثِ صحیح وضعیف کے درمیان (شیخ کا اختیار کردہ) یہ فرق محض تکلف ہے، شاید پس پردہ ''سننِ اربعہ'' کی ضعیف احادیث کو مہمل (ونا قابل استدلال) قرار دینا مقصود ہو، حالانکہ بہت سی ضعیف احادیث، احادیثِ صحیحہ کے لیے ''شواہد'' ہیں، لہٰذا ان کو صحیح احادیث سے یوں ممتاز کرنا مناسب نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی کتابوں کی تالیف کے موقع پر خود امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ کے بھی قطعاً یہ عزائم نہ تھے، اس لیے کہ وہ چاہتے تو محض صحیح احادیث پر بھی اکتفا کر سکتے تھے۔ بنا بریں ''سنن'' سے متعلق شیخ ناصرالدین رحمہ اللہ کے اس کام کو میں ان کے غیر مستحسن کاموں میں شمار کرتا ہوں۔

حکمِ حدیث کے متعلق دیگر ائمہ کے اقوال سے بے اعتنائی

ایک اور قابل گرفت بات یہ ہے کہ شیخ جب کسی ایسی حدیث کو ''صحیح'' قرار دیتے ہیں، جس کو دیگر حفاظ نے ''ضعیف'' کہا ہو تو دیگر اقوال کا تذکرہ نہیں کرتے، اگر وہ ذکر کر دیتے تو لوگوں کو ان کے اور دیگر حفاظ کے احکام کے درمیان آزادانہ موازنے کی چھوٹ مل جاتی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو محض اپنے اقوال کی اتباع پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں، جو کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں۔

شیخ البانی رحمہ اللہ کے علمی کام پر نظرِ ثانی کی ضرورت

انہی امور کی بنا پر میری دانست میں شیخ ناصرالدین البانی رحمہ اللہ کے کام پر درج ذیل انداز سے نظرِ ثانی ہونی چاہئے:

۱- جن احادیث کو شیخ نے صحیح یا ضعیف قرار دیا ہے اور ان سے پہلے ائمہ متقدمین نے بھی ان کو صحیح یا ضعیف ہی کہا ہے، انہیں اپنے حال پر رہنے دیا جائے۔

۲-جن احادیث پر ائمہ متقدمین کے برخلاف شیخ نے صحت یا ضعف کا حکم لگایا ہے تو دونوں حکموں میں موازنہ کیا جائے اور دلائل وقرائن کی روشنی میں شیخ ناصر کے موافق یا مخالف حکم بیان کیا جائے۔

اپنی سابقہ بات دہراتے ہوئے میں پھر کہتا ہوں کہ شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ''محدث'' تھے، میں نہیں کہتا کہ وہ ''حافظُ العصر'' تھے، انہوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس اس علم کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کئے ہیں اور اس طویل صحرانوردی نے ان میں فن کی بہترین مہارت ولیاقت پیدا کر دی تھی، اس لیے اس میدان میں ان کی مہارت کو کلی طور پر نظر انداز کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی مقام

رہا فقہی میدان تو مجھے ان کا کوئی بھی ایسا مسئلہ یاد نہیں، جس میں ان کی دلیل سے مطمئن ہوکر میں نے ان کی تحقیق قبول کر لی ہو، اس لیے کہ فقہ ان کا فن ہی نہیں، نہ ہی علمِ حدیث کی طرح فقہ میں ان کا انہماک رہا ہے، درحقیقت انہوں نے بعض علما کے شاذ مسائل لے کر ان کے ذریعے اپنے فقہی منہج کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

۱-مثال کے طور پر سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کے قول کو ہی لے لیجئے، ان سے پہلے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ''المُحلّٰی''(۲۰) میں یہ قول ذکر کر چکے ہیں۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الدُّرَر البَهِيَّة''(۲۱) میں اور نواب صدیق حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح ''الرَّوضة النَّدِيَّة''(۲۲) میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ ہی کی اتباع کی ہے۔ اور اپنے اس قول کے لیے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں کہ سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔

۲-زرعی پیداوار پر کن صورتوں میں زکوٰۃ واجب ہے؟ شیخ نے امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ(۲۳) کی اتباع میں ان کو صرف چار اجناس میں منحصر کر دیا ہے: ۱-گندم، ۲-جو، ۳-کھجور، ۴-کشمش۔ اس لیے کہ نص صرف ان چار اشیا کے متعلق ہے، اور دیگر اشیا کو ان پر قیاس کرنا درست نہیں۔ جبکہ جمہور فقہا سامانِ تجارت میں وجوبِ زکوٰۃ کے قائل ہیں، نیز وہ شہر کی دیگر مذکورہ اجناس اربعہ پر اشیاء خوردنی کو قیاس کرتے (ہوئے ان میں بھی زکوٰۃ کو واجب قرار دیتے) ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ شیخ نے یہ قول کیسے اختیار کر لیا!! حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ تاجر اپنا مملوکہ مال صندوق میں نہیں رکھا کرتا، بلکہ نقصان سے بچاؤ کے لیے ہمیشہ اسے سامانِ تجارت میں بدلتا رہتا ہے، تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاجر صرف اسی مال کا مالک ہے جو اس کے صندوق میں ہے، جبکہ اس کے گودام سامانِ تجارت سے اَٹے پڑے ہوں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کے متعلق مقاصدِ شریعت پر ان کی نگاہ کوتاہ تھی، نہ ہی وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے واقف تھے۔

۳-انہیں شاذ اقوال میں سے ایک عورتوں پر حلقہ بنے سونے کے زیورات کو حرام قرار دینے کا قول ہے۔

اس مسئلے میں شیخ نے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی ''المحلّٰی''(۲۴) کی پیروی کی ہے، چنانچہ ''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۲۵) میں بزعمِ خود حرمت کے دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''کوئی مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ بات کے خلاف کسی قول کی طرف نگاہِ التفات نہیں ڈال سکتا، خواہ اس کا قائل علم وفضل اور نیکوکاری میں کیسی ہی شان کا حامل کیوں نہ ہو، اس لیے کہ بہرحال وہ معصوم تو نہیں، یہی چیز ہمارے لیے اپنے موقف پر جماؤ کا باعث ہے، (ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ) کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے ان کے علاوہ کسی کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے''۔

فہمِ حدیث میں فقہا کا منہج

شیخ کا خیال ہے کہ کسی حدیث کو صحیح قرار دینے سے مشکل حل ہوجاتی ہے، حالانکہ یہ وسعت بہت سے امور میں خلل کا باعث بن سکتی ہے۔ ائمہ متقدمین معاذ اللہ ''حدیثِ صحیح'' کے تارک ہرگز نہ تھے، بلکہ وہ ہر حدیث کو اس کا مناسب مقام دیتے تھے، مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اِس روایت کو ہی لے لیجئے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ہماری خاطر (اشیا کی) قیمتوں کا تعیّن فرما دیجئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: ''إن اللّٰه هو المسعِّر القابض الباسط الرزاق''۔ (اللہ تعالیٰ ہی قیمتیں مقرر کرنے والا، (رزق میں) تنگی اور کشادگی کرنے والا ہے اور وہی رزق دینے والا ہے) اِس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''جامع الترمذی''(۲۶) میں نقل کیا ہے، اس کے باوجود ائمۂ مجتہدین ''نرخ بندی'' کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: ''بلاشبہ یہ حدیث، حق وسچ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، لیکن یہ ''عام مخصوص منه البعض'' کی قبیل سے ہے، انہوں نے اس حدیث کو اُس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بائع ومشتری کا باہمی معاملہ صلاح پر مبنی ہو اور دورِ حاضر کی طرح ان میں حرص ولالچ نہ ہو، بلاشبہ ایک ایسے معاشرے میں ''نرخ بندی'' ترک کردی جائے گی، لیکن معاشرتی تبدیلی کی صورت میں قیمتوں کا تعین ناگزیر ہے۔

شیخ محمد بخیت مطیعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی ''المجموع'' کے ''تکملة''(۲۷) میں اس مسئلے کے متعلق علما کے مختلف اقوال جمع کردیئے ہیں۔ لیکن شیخ ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ ایسے امور کی طرف التفات نہیں فرماتے، ان کے نزدیک (سنداً) صحیح حدیث کی مخالفت جائز نہیں، حالانکہ ائمہ سلف بھی صحیح احادیث کے مخالف ہرگز نہیں تھے، بلکہ وہ احادیثِ رسول کو واضح فرماتے تھے اور اس سلسلے میں وظیفۂ نبوت کی پیروی کرتے تھے، (جس کا اِس آیت میں ذکر ہے) فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ''(۲۸) ''اے پیغمبر! ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں''۔ یعنی لوگوں کے سامنے مرادِ باری تعالیٰ واضح کریں، چنانچہ ائمہ مجتہدین بھی یہی وضاحت کا فریضہ ادا کرتے تھے، لیکن وہ

معصوم نہیں ہیں، خطأ وصواب دونوں ہی احتمال رکھتے ہیں، البتہ نصوص کے فہم کے لیے جو منہج انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ شریعت کے درست فہم تک پہنچاتا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ائمہ مجتہدین نے اگر کسی حدیث کو رد کیا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اس کے رد کرنے والے ملیں گے اور وہ ایسی احادیث کو لیتے ہیں جس پر کسی نہ کسی صحابیؓ کا عمل ہو، مثلاً: درج ذیل حدیث کو دیکھئے: ''من مسّ ذکرہ فلیتوضأ''۔ (جس نے اپنے ذکر کو چھوا تو اسے چاہیے کہ وضو کرے) اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مسند احمد''۔ (۲۹) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) ''صحیح'' حدیث ہے، اسی پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل ہے۔

اب ایک اور حدیث پر نظر ڈالیے: ''إنما ھو بضعة منک''۔ (وہ تو تیرے جسم کے گوشت کا ہی ایک ٹکڑا ہے) اس حدیث کو بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مسند احمد''۔ (۳۰) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) یہ ''حسن'' ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو لیتے ہیں، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ''مسِ ذکر'' ناقضِ وضو ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ناقض نہیں، اور دونوں نے اپنے مذہب کے سلسلے میں اپنے تئیں صحیح احادیث پر ہی اعتماد کیا ہے، اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم میں سے بھی بعض نے ان میں سے ایک حدیث کو لیا اور بعض نے دوسری حدیث پر عمل کیا ہے۔

یہ (فقہی) اختلاف تو دورِ صحابہؓ سے چلا آ رہا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے: ''کُنتُمْ خَیْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ''۔ (۳۱) (تم وہ بہترین امّت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ یہ ''خیریت'' محض سلوک میں منحصر نہیں، بلکہ علم بھی اس کے تحت داخل ہے، اس لیے کہ سلوک کی بنیاد تو علم ہے اور وہ علم کا ہی ثمرہ ہے۔ لہٰذا اختلاف جب تک عقل وفہم کے دائرے میں رہے تو وہ تنوع کا کرشمہ اور اجتہاد وابداع کی جلوہ گاہ ہے، اسلام اس کو پسند کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ البتہ جب اختلاف، عقل سے قلب کی طرف سرایت کر جائے اور اس کی کوکھ سے باہمی کش مکش، سب وشتم، قطع تعلق اور کینہ وعداوت جیسے موذی باطنی امراض جنم لینے لگیں تو وہ شرعاً ممنوع ہو جاتا ہے، اسلام ایسی چیزوں کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔

بعض دیگر فقہی آرا

شیخ کی بعض فقہی آرا گرد وپیش کے زمانے سے ان کی دوری کی دلیل ہیں، ان کے کئی قریبی شاگردوں کے واسطے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ حرمتِ اختلاط کی بنیاد پر کسی طالبِ علم یا طالبہ کے جامعات اور یونی ورسٹی جانے کو حرام قرار دیتے تھے، گویا اس طرح وہ یونی ورسٹیوں کو مسلمان طلبہ سے خالی کرنا چاہتے تھے۔ نیز وہ مسلمان طلبہ کے ذہنوں میں اسلام کے عمومی اصول راسخ کرنے اور اس کا منہج واضح کرنے کی بجائے بعض ایسی چیزوں کے داعی تھے، جن کے ترک سے دورِ حاضر میں کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا،

مثلاً: داڑھی چھوڑنا اور پتلون ترک کرنا، وغیرہ۔ **(حاشیہ ملاحظہ فرمائیں)**

چنانچہ جس طرح وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے ناواقف تھے، اسی طرح اسلام کے اجتماعی ومعاشرتی نظام سے بھی نابلد تھے، بلکہ ان کے ہاں اس عظیم دین کا کوئی جامع نظریہ ہی نہیں ملتا، کیونکہ اس موضوع کو نہ تو انہوں نے پڑھا اور نہ ہی اس طرف توجہ کی ہے۔

شیخ ناصر رحمۃ اللہ علیہ کی ''سلفیت'' نصوصِ شرعیہ کے گہرے فہم کی بنیاد پر ہے، نہ امت پر طاری تقلید جامد کو توڑنے کے لیے، بلکہ یہ ''نصوص کی حرف بحرف اتباع'' ہے، جس سے (آج کے دور میں) داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ ہوگئیں ہیں، ایک ایسی اتباع جس میں دیگر تاویلی وجوہ کا کوئی اعتراف ہی نہیں، اس معنی کے اعتبار سے گویا ''سلفیت'' فقہی مذاہب کی وسعتوں کو مزید تنگی وتشدد پر مبنی جمود کی خاطر ترک کرنے کا نام ہے''۔

مخالفین کے ساتھ شدت آمیز رویہ

ان تمام باتوں کے باوجود میں انہیں ایک مخلص انسان سمجھتا ہوں، جس نے حصولِ جاہ ومنزلت کی بجائے محض رضائے خداوندی کی خاطر علم حاصل کیا، لیکن میں انہیں (ہر نوع کی غلطیوں سے) پاک نہیں سمجھتا، ان کے اخلاص کے پورے اعتراف کے باوجود ان کا اپنے مخالفین کے ساتھ سخت رویہ، جو اہل علم میں ہمیں نہیں دکھائی دیتا، میرے نزدیک قابلِ نقد ہے، آپ کا کسی مسئلے میں ان سے اختلاف کرنا ہی ان کے نزدیک (زبان کے نشتر لگانے کے لیے) کافی ہے، پھر وہ آپ کو ایسے اوصاف سے نوازیں گے جن سے وہ ہمیشہ اپنے مخالفین کی مدح سرائی کرتے رہتے ہیں، مثلاً جمہور فقہا کی رائے اختیار کرنے والے کو یوں یاد کرتے ہیں: ''**هذا جمهوری**'' (یہ جمہور کا پیروکار ہے) گویا یہ کوئی عیب ہے، اسی طرح ''**هذا لایفقه**'' (اس کو سمجھ بوجھ ہی نہیں)، ''**هذا لیس بفنه**'' (یہ اس فن کا آدمی ہی نہیں)، ''**هذا لیس عنده تحقیق**'' (اس شخص کے ہاں تحقیق کا کوئی گزر نہیں) اور ان کے علاوہ ایسے اوصاف کہ جن کو ایک عالم کجا، عام آدمی بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔

(حاشیہ) زیرِ بحث مسائل کے متعلق اتنی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام غیر محرم مرد وعورت کے اختلاط کو ناپسند کرتا ہے اور اس پہلو سے اسلامی احکام کا فلسفہ بالکل واضح ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں عصری تعلیمی اداروں کا مخلوط تعلیمی نظام، اسلامی مزاج سے قطعاً موافقت نہیں رکھتا، یہ نظام بے شمار شرعی، اخلاقی معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے، آئے دن کے احوال واقعات سے اس بات کی تصدیق ہوتی رہتی ہے، اسی بنا پر اہل علم کی اکثریت نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے اور اس کی اصلاح کی تدابیر بھی تفصیلاً تحریری صورت میں آچکی ہیں، جن کی رعایت کی صورت میں ہی مشروط جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے، البتہ اس نظام کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود اس کو قطعی حرام بھی نہیں کہا جاسکتا، نیز لباس کے متعلق اسلام نے جو اصولی رہنمائی کی ہے، اس کی عملی تطبیق امت میں متوارث چلی آرہی ہے، جس میں اقوامِ غیر کے ساتھ تشبّہ سے اجتناب ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے کارفرما ہے۔ رہا داڑھی کا مسئلہ تو اس کے متعلق نرم موقف رکھنے والے علما کے ساتھ ایک عرصے سے مباحث جاری ہیں اور جمہور اہلِ علم وجوب ہی کے قائل ہیں، بہرکیف ان مسائل میں شیخ ارنؤوط کی تعبیر وتشریح سے کلّی اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ کی یہی شدت ان کے پیروؤں میں بھی سرایت کرگئی ہے، ان کی آرا کی بنا پر آئے دن مساجد میں ہونے والے جھگڑوں کا ہر ایک تذکرہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے کیسے باہمی عداوتوں تک نوبت جا پہنچتی ہے!!

ہماری معلومات کے مطابق ائمہ متقدمین بھی اپنی آرا کا اظہار کرتے تھے، لیکن دیگر اہلِ علم کی آرا کا احترام بھی کرتے تھے، وہ اپنے مخالفین کے خلاف جارحانہ کلمات زبان پر نہیں لاتے تھے، ان ائمہ کا یہ جملہ سب کو یاد ہوگا، جو ان سے منقول اور مشہور ہے کہ: ''**رأيي صواب يحتمل الخطأ، ورأى غيري خطأ يحتمل الصواب**''۔ (میری رائے درست لیکن غلطی کا احتمال ہے اور دیگر آرا غلط لیکن درستگی کا امکان رکھتی ہیں) نیز امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ بھی ہمیں یاد ہے کہ: ''**ما عبر جسر بغداد أحد أعلم من إسحاق بن راهويه ، غير أننا نخالفه في أشياء**''۔ (اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا عالم اس شہرِ بغداد کے پل سے نہیں گزرا، لیکن کچھ مسائل میں ہمارا ان سے اختلاف ہے)۔

شاید شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تشدد ائمہ کبار کے بیان کردہ اس قاعدہ سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ''**لاينكر المختلف فيه**'' (سلف کے درمیان مختلف فیہ مسئلے پر انکار نہیں کیا جائے گا) یعنی اختلافی مسائل میں کسی مجتہد پر نکیر نہیں کی جائے گی، لیکن شیخ کا رویہ اس قاعدے کے برخلاف ہے، وہ اختلافی مسائل پر بھی نکیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ **إنه خير مسؤل، والحمد لله رب العالمين۔**

مآخذ ومراجع

۱:.....ملاحظہ فرمائیں:

۱–الألباني شذوذه وأخطائه لمولانا حبيب الرحمن الأعظمي، مكتبة دارالعروبة كويت، ۱۴۰۴–۱۹۸۴ء۔

۲–تناقضات الألباني الواضحات فيما وقع له في تصحيح الأحاديث وتضعيفها من أخطاء وغلطات للشيخ حسن السقّاف، دارالإمام النووي عمان الأردن، ۱۴۱۳ھ–۱۹۹۲ء۔

۳–خطبة الحاجة ليست سنّة في مستهلّ الكتب والمؤلفات للشيخ عبدالفتّاح أبوغدّة رحمه الله، دارالبشائر الإسلامية بيروت، ۱۴۲۹ھ، ۲۰۰۸ء۔

۴–التعريف بأوهام من قسّم السنن إلى صحيح وضعيف للشيخ محمود سعيد ممدوح، دارالبحوث للدراسات الإسلاميّةوإحياء التراث دبئي، ۱۴۲۱ھ–۲۰۰۰ء۔

۵–تنبيه المسلم إلى تعدي الألباني على صحيح مسلم للشيخ محمود سعيد الموقر۔

۶– إباحة التحلّي بالذهب المحلق للنساء والردّ على الألباني في تحريمه للشيخ اسماعيل الأنصاري–رحمه الله–

۷– تصحيح حديث صلاة التراويح عشرين ركعة، والرد على الألباني في تضعيفه، للشيخ اسماعيل الأنصاري– رحمه الله –

۲:.....مشكوة المصابيح بتحقيق الشيخ الألباني، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر، ج:۱، ص:۳۹، رقم الحديث:۱۱۲، المكتب الإسلامي، ۱۳۹۹ھ–۱۹۷۹ء۔

۳:.....صحيح الجامع الصغير وزيادته، ۲/۱۲۰۰، رقم الحديث:۷۱۴۲، المكتب الإسلامي ۱۴۰۸ھ– ۱۹۸۸ء۔

۴:.....التکویر:۸۔

۵:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۴/۴۴۷-۴۴۸،رقم الحديث:۱۸۳۳، مكتبة المعارف رياض ، ۱۴۱۵ھ- ۱۹۹۵ء۔

۶:.....صحيح مسلم،كتاب صفة القيامة والجنّة والنار،باب ابتداء الخلق وخلق آدم عليه السلام،۷/۴۴۹، رقم الحديث: ۷۰۴۹،مكتبة البشرى كراتشى۔

۷:.....التاريخ الكبير، ۱/۴۱۳-۴۱۴،دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد دكن ۱۳۶۱ھ۔

۸:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۲/۶۴۸-۶۴۹،رقم الحديث: ۹۵۹۔

۹:.....مسندأحمد بتحقيق الشيخ شعيب الارنؤوط،رقم الحديث:۱۹۶۷۸،مؤسّسة الرّسالة بيروت۔

۱۰:.....التاريخ الكبير، ۱/۳۸-۳۹۔

۱۱:.....یہی بات ان کے متعلق ایک اور معاصر عالم معروف محقق ومحدّث شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ) نے بھی لکھی ہے: ''وإنما أدى إلى هذا الشذوذ اعوجاجُ فهمه لبعض النصوص لضعف معرفته بأصول الفقه، بل أصول الرواية والدراية أيضا''. (خطبة الحاجة ليست سنّة فى مستهلّ الكتب والمؤلفات ،ص:۵۲)۔ (بعض نصوص میں کج فہمی نے ان (شیخ البانی رحمہ اللہ) کو اس شذوذ تک پہنچا دیا ہے، اور اس کی وجہ اصول فقہ، بلکہ اصولِ روایت ودرایت سے واقفیت کی کمی ہے)

۱۲:.....مسندأحمد،رقم الحديث: ۱۸۸۷۰۔

۱۳:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۷/۵۵۲،رقم الحديث: ۳۱۸۱۔ ۱۴:.....التوبة: ۳۱۔

۱۵:.....سنن الترمذى بتحقيق الدكتور بشارعواد معروف،أبواب تفسير القرآن،باب: ''ومن سورة التوبة ''۵/۱۷۳،رقم الحديث:۳۰۹۵،دار الغرب الإسلامى بيروت ، ۱۹۹۸ء۔

۱۶:.....صحيح الترمذى،۳/۵۶،رقم الحديث: ۲۴۷۱، المكتب الإسلامى ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء۔

۱۷:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۷/۸۶۶،رقم الحديث:۳۲۹۳۔

۱۸:.....روح المعانى، تفسير قوله تعالى: ''اتخذوا أحبارهم''(التوبة:۱۳)۵/ ۲۷۶،دارالكتب العلميّة بيروت ۱۴۲۶ھ- ۲۰۰۵ء۔

۱۹:.....سلسلة الأحاديث الضعيفة، ۱/۵۷،رقم الحديث:۴۰،و ۲/۶،رقم الحديث:۵۱۰،المكتب الإسلامى ۱۴۰۵ھ- ۱۹۸۵ء۔

۲۰:.....المحلى،كتاب الزكوة،باب أحكام التجارة،۵/۲۳۳- ۲۴۰، دارالتراث القاهرة۔

۲۱:.....الدررالبهيّة،كتاب الزكاة،باب زكاة الذهب والفضّة،ص:۲۲، مكتبة الصحابة طنطا مصر ۱۴۰۸ھ- ۱۹۸۷ء۔و السموط الذهبيّة الحاوية للدرر البهيّة للشوكانى، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، ۱۰۷، مئوسّسة الرسالة بيروت ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء۔

۲۲:.....الروضة النديّة شرح الدررالبهيّة،كتاب الزكاة،باب زكاة الذهب والفضة، ۱/۲۸۶،المكتبة العصريّة بيروت ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء۔

۲۳:.....نيل الأوطارشرح منتقى الأخبار من أحاديث سيّد الأخيار،كتاب الزكوة،باب الزروع والثمار،۴/۱۶۱، مكتبة مصطفى البابى مصر۔

۲۴:.....المحلّى،باب أحكام لبس الحرير والذهب،۱۰/۸۴۔

۲۵:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة، ۱/۵۹۶، رقم الحديث:۳۳۷۔

۲۶:.....سنن الترمذى، أبواب البيوع، باب ماجاء فى التسعير،۲/۵۷۲، رقم الحديث:۱۳۱۴۔

۲۷:.....تكملة المجموع شرح المهذب،كتاب البيوع،باب النجش،۱۲/۱۰۹-۱۲۱،داراحياء التراث العربى ۱۹۹۵ء۔

۲۸:.....النحل:۴۴۔ ۲۹:.....مسندأحمد،رقم الحديث:۲۷۲۹۳۔

۳۰:.....مسندأحمد،رقم الحديث: ۱۶۲۸۶۔ ۳۱:.....آل عمران:۱۱۰۔